R. N. 2186/57. Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29
Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپے
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

جلد ۲۰ - شمارہ ۳۳ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - یکم ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء

سید حبیب الرحمٰن

عملی تنقید کے بارے میں

اُردو زبان کا ارتقا لسانیات کی تاریخ میں کچھ عجیب سا اور دلچسپ سا باب ہے۔ اس کی ترقی میں تضاد کے عمل کا جو دخل ہے اس کے سمجھانے کے لئے ایک ہی اصطلاح موزوں معلوم ہوتی ہے اور وہ ہے "لاؤسیت"۔ جس طرح دنیا کی تاریخ کے برخلاف لاؤس کے شہزادے سوشلزم کی باتیں کرتے ہیں جبکہ وہاں کے عوام ان کی خاموش پیروی کرتے ہیں، اُردو کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ ہے۔ عام سماجیات کا اصول یہ ہے کہ جس جگہ عوام جس ڈھنگ کی زندگی گزارتے ہیں اسی ڈھنگ کا ان کا شعور ہوتا ہے اور اس لئے اس جگہ کا ادب بھی اسی نوعیت کا ہوگا۔ مگر اُردو کے تعلق سے یہ بات متضاد ہے۔ اُردو بولنے والے عوام جتنے پس ماندہ سماج کے تقاضوں سے دور فرسودگی پسندی کے شکار ہیں اتنی ہی اُلٹی اُردو ادب کی تصویر ہے۔ اُردو ادب بہت ترقی یافتہ اور زندگی کے سنوارنے کی کشمکش میں ملک کی قومی اُمنگوں، آرزوؤں اور ولولوں کا آئینہ دار ہے۔ لاؤس کے شہزادوں کی طرح ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور اعلیٰ سماجی سطح کے ادیب اور شاعر اس زبان کو پروان چڑھانے میں سب سے زیادہ سرگرم ہیں جبکہ لاکھوں اُردو بولنے والوں پر یاسیت اور بے شعوری چھائی ہے۔ اس لئے بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو ادب کی ہمہ جہتی میں قومی اور بین الاقوامی زندگی کی کشمکش میں اس کی حصہ داری کی جتنا وکا جواز کیا ہے۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔ اس سے اکثر اُردو کے مسائل سے واقفیت کی دلیل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو ہندوستان کی ساری زبانوں سے بالکل مختلف زبان ہے۔ جہاں اور زبانیں علاقائی اور جغرافیائی حدود کی حامل ہیں وہاں اُردو کا خمیر کئی علاقوں کی زبانوں اور تمدنوں کے اتحاد سے اُٹھا ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ کئی علاقوں کے درمیان قومی ترجمان بنے اس لئے اُردو زبان کے دانشور اور ان کا ادب اُردو عوام کی پس ماندگی اور بے حسی کے باوجود ملک کے سارے علاقوں کے عوام اور ان کے جذبات اور زندگی کا نمائندہ ہے۔ اس طرح اُردو زبان کے کردار میں بین الاقوامیت آگئی ہے۔ ورنہ اور زبانوں کی طرح اس کا شیوع صرف اُردو زبان کے بولنے والے ہی ہوتے تو یہ سمندر کبھی کا سوکھ گیا ہوتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج اُردو زبان بولنے والوں کے مسائل اور اُردو زبان کے مسائل میں فرق پڑتا جا رہا ہے۔ جہاں اردو زبان والوں کی بستیوں کی متعدد کوششیں ان کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہیں، اُردو زبان کی ترقی میں کہیں فرق نہیں آ رہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو زبان کے عام بولنے والوں کی خدمات سے اس کی ترقی میں اور چار چاند لگ سکتے ہیں۔

اُردو ادب اور شاعری کی ترقی کا انگریزی ادب اور شاعری سے مقابلہ کیا جائے تو ایک اور حیرت انگیز تضاد ہمارے سامنے آتا ہے۔ اُردو زبان والوں کی سماجی پس ماندگی و محرومی اور کم نصیبی کے احساس کے باوجود اُردو میں مسلسل ترقی اور زندگی کے آثار ملتے ہیں۔ اُردو ادیب اور شاعر اچھے ادب کے ذریعہ کم از کم جا بجا تنگ دستی اور کٹھن حالات میں زندگی گزارتے ہوئے وسعت مند اور اعلیٰ ادب پیش کر رہا ہے وہاں انگریزی ادب اس کی اپنی حیثیت کے تناسب سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے انگریزی ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے "ٹائمس" کے ادبی ضمیمہ نے "Uncommitted Talents" کے عنوان سے جو اداریاتی تنقید کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی کے نئے مصنف اور ناول نگار اپنے زمانے کے سماجی تقاضوں سے ناواقف ہیں اور بہت سطحی غیر سنجیدہ اور رجعت پسند ادب پیش کر رہے ہیں۔

آلڈس ہکسلے نے اس صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے میں جو حقیقت پسند نقاد کی حیثیت سے انگریزوں کی سرمایہ دارانہ زندگی پر تنقید کرنے کی شہرت حاصل کی تھی بعد کے سالوں میں رجعت پسند طرز تنقید سے ہمکنار ہو گئے۔ انھوں نے سنہ ۱۹۳۲ء میں 'Brave new world' اور پھر جنگ کے بعد 'Ape and essence' کے نام سے جو کہانیاں لکھی ہیں اس سے سوشلزم کے مستقبل کو بہت کریہہ اور ڈراونے روپ میں پیش کیا گیا ہے اور اس طرح سرمایہ دارانہ سماج کی خدمت کا فرض انجام دیا ہے۔ یہی حال دوسرے انگریز ادیبوں کا ہے۔ جنگ کے بعد کے اینگلو امریکی ادب میں

جو بات شعوری طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں کے ادب اور عوام میں دوری واضح ہو اور زندگی کو مسخ کر کے قارئین کے ذہنوں میں زہریلی ناامیدی اور آدمی کی طاقت کے تعلق سے بے یقینی پیدا کی جائے اور ترقی اور امن کی قوتوں کی تحقیر کی جائے۔

انگریزی اور امریکی شاعری میں رجعت پسندی اور شاعر کی بے بسی کا اندازہ Margaret Schlauch کی لکھی ہوئی ایک کتاب "Modern English and American poetry" سے ہو جائے گا جس میں مارگریٹ شلاخ نے بتایا ہے کہ انگریزی زبان کی شاعری میں آج بہت برے دن آئے ہیں کیونکہ شعر پڑھنے اور سننے کے لئے امریکہ میں ماحول نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کو شاعروں کے نام تک بھی معلوم نہیں۔ شاعر ایک زمانے میں قبیلے کی آواز تھا۔ بعد کے حالات میں جاگیرداری دور میں بھی وہ اپنے چاہنے والوں سے محروم نہیں تھا پھر طباعت کی ایجادات نے اس کے لئے اور وسیع میدان تیار کئے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں تجارتی ترقی کی وجہ سے بھی شاعر کو کامران زندگی کے اور نئے امکانات نصیب ہوئے۔ اٹھارھویں صدی میں مشینی صنعت کی ترقی کی وجہ سے شاعر اور منظر عام پر آ کر عام آدمی کو مخاطب کرنے لگا مگر بیسویں صدی میں جیسے جیسے سنسنی خیز صحافت نے ترقی شروع کی شاعر پس منظر میں چلا گیا۔ "ٹامس ہارڈی" اور جارج میرڈتھ کے کلام میں اس وقت کی پکار اور ناامیدی کی جھلک ملتی ہے۔ اب شاعر شہرت کے لئے اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگا۔ مارگریٹ شلاخ کہتی ہیں کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اس دور کا اینگلو امریکی شاعری کی سماج سے علیحدگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ انسان کو منفی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے انسان کی عظمت کی بجائے اس کے ہاں انسان کی حقارت کا احساس زیادہ ہے۔ اس کے پچھڑے ہوئے ملکوں کے عوام کو کچل کر رکھنے کے تصورات سادہ لوح انسانوں کے لئے نفرت اور یہودیوں کے لئے حقارت اور ایسے سارے رجحانات فاشستی تصورات سے قریب تر ہیں۔

مگر اس کے برخلاف اردو کے نمائندہ ادب میں ملک، قوم، اور عالمی انسانیت کے لئے ہمدردی بنی نوع انسان کی فضیلت، جمہوریت اور عالمی امن اور بھلائی کی تصویر ملتی ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم اردو کے شاعروں اور ادیبوں کے تعلق سے اردو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے رویہ کو دیکھتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ وہ ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کرنے کی بجائے "زور برشکوہ ضعیف" کے مصداق اپنی ناکامی نامرادی اور بے مقصدیت جھنجھلاہٹ کا بخار انہی غریب ادیبوں اور شعراء پر اتارتے ہیں جو واقعی ان مشکل حالات میں ادب اور زندگی کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ بڑے انقلابی انداز میں دیوان خانوں، ادبی جلسوں اور مشاعروں میں اپنی توانائی اس مجہول عمل میں صرف کرتے ہیں کہ کسی طرح کسی ابھرنے والے کسی ممتاز یا بے جگری سے کام کرنے والے کسی ادبی کارکن یا مقبول ادیب کے خلاف محاذ بنائیں اور تنقید کریں کیونکہ ان کی دانست میں تنقید کسی کے باشعور اور انقلابی ہونے کی علامت ہے۔ انکی انا کی تسکین اس طرح ہوتی ہے کہ وہ خود ایک گروہ بنا لیتے ہیں اور پھر کسی مصنف یا شاعر یا ادبی کارکن کی عیب جوئی کی جاتی ہے تو اگر کچھ نہیں تو وہ یہ کہیں گے کہ ہمارے یہ ادبی اشخاص گروہ بندی کرتے ہیں۔ اداروں میں اجارہ داری کرتے ہیں یا ہر کردہ کام میں بے قاعدگی کے رستے میں وغیرہ۔ ان میں یہ شعور نہیں ہے کہ دراصل ہمارے اداروں، ہماری انجمنوں کے ادبی کارکنوں میں اگر کوئی کوتاہیاں ہوں بھی تو اس کی ذمہ داری ہم سب پر عاید ہوتی ہے غالباً ان کے کام میں بے قاعدگی ادبی رسالوں اور انجمنوں کی غربت ادبی کارکنوں کی قلت اور چند لوگوں پر کام کی زیادتی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایکی گروہ بندی بھی غالباً ہماری آپسی گروہ بندیوں کا عکس ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ بعد آزادی کے جست ہمارے نوجوانوں میں یہ احساس بڑھ گیا ہے کہ ہمارے ملک کے روایاتی محنت، انکساری اور قربانی کے جذبے کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ یا تو ہمارے قدیم ادب میں تنقیدی ادب کی کمی تھی یا اب یہ حالت ہو رہی ہے کہ ہم تنقید کو سستی دوسرے درجہ کی آسان چیز سمجھنے لگے ہیں اور کسی ممتاز ادیب پر تنقید کر کے جیسے ہم اپنے بڑے ہونے کا جواز ڈھونڈتے ہوں اور بڑا فرض ادا کرتے ہوں۔

پیسے تنقید کا مجہول عمل ایک اعتبار سے جمہوری اصولوں کی بے مزہ نقالی بھی ہے۔ ظاہر ہے یہ عمل تخلیقی تنقیدی ادب سے مختلف ہے جو خوش قسمتی سے جاری ہے جس طرح اعلیٰ اور ادنیٰ ادب میں واضح فرق ہے۔ اسی طرح اچھی تنقید اور بری تنقید میں بھی فرق ہے۔ بنیادی اعتبار سے ادب اور ادبی تنقید دونوں ہی تخلیقی کام ہیں۔ ادیب زندگی کے سیکڑوں ماثل مظاہر کے مطالعہ سے کوئی خیال حاصل کرتا ہے اور اس مجرد خیال کو ایک مشترک پیکر کے روپ میں انسانی شکل اور گوشت پوست عطا کرتا ہے۔ نقاد اس گوشت پوست کے پیچھے جو خیال ہے اس کا بے تعصبی سے تجزیہ کرتا ہے۔ اس کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ادب اگر زندگی کی تنقید ہے تو ادبی تنقید اس تنقید کی تنقید ہے۔ اس اعتبار سے ادب اور تنقید میں کمیت اور کیفیت کا ہی فرق ہے مگر بنیادی اعتبار سے دونوں تخلیقی کام ہیں۔

ادبی کام تخلیقی کام اس لئے ہیں کہ ادیب عام آدمی کی بلند روحانی خصوصیات اور اس کے کردار کے مقصدی اور مثالی خدوخال کو واضح کرتا ہے اور ایسے حسن کارانہ پیکر جنم دیتا ہے جو دوسروں کے لئے مثال بن سکیں۔ وہ اس طرح اپنے جذبات اور تجربوں کو جو اسے زندگی میں حاصل ہوتے ہیں تخیل کی آنکھ سے دیکھ کر اور غور و فکر کے بعد انکی از سر نو تخلیق کرتا ہے جس سے حسن اور مسرت کی ایک نئی دنیا تخلیق پاتی ہے۔

اسی طرح تنقید کے لئے بھی بڑے تخیل کی ضرورت ہے۔ مشاہدہ بے شک تخیل کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ ہے مگر تخیل مشاہدہ کا عطر ہے اس لئے وہ حقیقت کی ٹھوس سطح کو شعور کے ایک لمحاتی عمل میں پا سکتا ہے۔ میز پر رکھی ہوئی ایک موٹی کتاب کی ضخامت کا اندازہ کرنے کے لئے مشاہدہ کو اسکے اطراف چکر لگانے کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ وہ مشاہدہ آنکھوں کو نظر آنے والی جہت کو ہی دیکھ سکتا ہے مگر اسکے برخلاف تخیل اس کتاب کی ساری چھ جہتوں کو ایک جست میں ایک خلاصہ کی شکل میں دیکھ سکتا ہے۔ فرانسیسی فلسفی اور ادیب ژاں پال سارتر تخیل کے بارے میں کہتا ہے کہ تخیل کی آنکھ سے دیکھی ہوئی مجموعی تصویر جہتوں کی کثرت کی آویزش اور اتحاد کے عمل سے پوری ہوتی ہے جس کا اصل حقیقت سے مناسبت کا رشتہ بدستور قائم رہتا ہے۔ گویا مشاہدہ کی دیکھی ہوئی حقیقت تخیل میں آ کر ایک نئی حقیقت یا غیر حقیقت (اصل سے غیر) بن جاتی ہے۔ نقاد ان نئی حقیقتوں یا غیر حقیقتوں کو اپنے تخیل کی آنکھ سے دیکھ کر انکی آویزش سے ایک مزید نئی حقیقت پیدا کرتا ہے یعنی اگر ادیب تخیلی پیکر کے حاصل کرنے میں مشاہدہ کی نفی کرتا ہے تو نقاد اپنے تخیل کی مدد سے ادیب کے دئے ہوئے پیکر کی نفی کر کے ادیب کے ذہنی جذباتی اور معانی حقائق کو اس کے سماجی پس منظر میں دکھا کر اصل حقیقت سے مماثلت پیش کرتا ہے۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

اداریہ

کیا ہندوستانی زبانوں کے لئے ایک رسم خط ضروری ہے؟

دلی میں بڑے وزیروں کی جو کانفرنس حال میں ہوئی تھی اس میں یہ بھی کہا گیا کہ ساری ہندوستانی زبانوں کے لئے اگر دیوناگری خط استعمال کیا جائے تو بہتر ہے۔ اسکے جواز میں بتایا گیا ہے کہ یہ جذباتی ہم آہنگی کے لئے مفید ہوگا۔

ہم جذباتی ہم آہنگی اور قومی وحدت کے پُرجوش حامی ہیں، مگر اس کے لئے یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کا رسم خط ایک کر دیا جائے۔ اس سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ ایک قوم کے لئے ایک زبان ضروری ہے اس لئے سب ہندی کو اختیار کر لیں، مگر جب علاقائی زبانوں کے بولنے والوں نے اپنی زبان کو نظرانداز کرنا اور ہندی کو اختیار کرنا گوارا نہ کیا تو اب یہ کہا جا رہا ہے کہ کم سے کم ایک رسم خط ہی اختیار کر لیا جائے۔ در اصل قومی وحدت کو مضبوط کرنے کے لئے یہ سطحی طریقے ہیں اور ان سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسئلے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

ظاہر ہے کہ قومیت کا تصور ہمارے یہاں مغرب سے آیا ہے اور مغرب میں کوئی ایسا بڑا علاقہ ہندوستان کے برابر نہیں ہے، جس کے مسائل سے ہمیں مدد ملے۔ یورپ کے وفاق کا خواب اس لئے شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا کہ وہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ان کی علیٰحدہ علیٰحدہ ترقی یافتہ زبانیں ہیں، جنھیں چھوڑنے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ اسپرانٹو کا حشر معلوم ہے اور بیسک انگریزی بھی آئی اے رچرڈس اور دوسرے علما کی کوششوں کے باوجود زیادہ کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔ گویا یہ بات واضح ہو گئی کہ علاقائی زبانوں کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور ان کو ترقی کے مواقع دینا ضروری ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ مختلف علاقائی زبانوں کے درمیان خط وکتابت کس زبان میں ہو تو یہ بات اب واضح ہو گئی ہے کہ یہ جگہ ہندی کو دی جائے مگر خاصی مدت تک موجودہ دقتوں کے پیش نظر انگریزی ایک مزید سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج رہے۔ اس طرح علاقائی زبانوں کی ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی اور قومی وحدت کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے۔ اب رسم خط کو ایک کر دینے کا سوال اٹھایا گیا ہے تو اس مسئلے کو محض سیاسی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ علمی حیثیت سے اور جذباتی حیثیت سے بھی۔ جذباتی ہم آہنگی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جذبات کا خون کیا جائے اور چند حقایق کو نظرانداز کیا جائے۔ دیوناگری رسم خط کے متعلق یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ وہ تمام حیثیتوں سے دوسرے خطوں سے بہتر ہے۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لکھنے والے دوسرے خطوں کے لکھنے والوں سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ مگر ایسے معاملات میں صرف تعداد کو ملحوظ رکھنا بڑی چھوٹی بات ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دیوناگری حروف میں صوتی مناسبت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اس لحاظ سے اس کے سیکھنے میں آسانی ہوتی ہے، مگر موجودہ دور میں جگہ اور وقت کی کفایت کا سوال بھی اہم ہے، پھر بہت سی آوازیں ایسی ہیں، جن کو دیوناگری رسم خط ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہمارے نزدیک علمی و ادبی معاملات میں سب زبانوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کا اصول درست نہیں ہے اور اس سے واقعی قومی وحدت میں کوئی مدد نہیں ملتی، بلکہ در اصل کچھ نقصان ہی پہنچا ہے۔ ہندوستان میں چودہ بڑی زبانیں ہیں۔ یہ سب قومی زبانیں ہیں، ان میں سے کچھ دیوناگری میں اور کچھ دوسرے خطوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح ان زبانوں کو ترقی دینا چاہئے۔ رسم خط بدلنے سے سارا ادبی سرمایہ تو منتقل نہیں ہو جائے گا۔ ذہن تو نہیں بدل جائیں گے۔ پھر یکسانیت کی یہ کوشش در اصل اس رنگارنگی کو جو ہماری بڑی طاقت ہے، ایک سپاٹ، سطحی رنگ کی خاطر مجروح کر دے گی۔ جذباتی ہم آہنگی کے لئے ایک رسم خط کی کوشش ہی غلط ہے۔ ہاں دیوناگری میں دوسری زبانوں کے سرمایے کو پیش کرنا تاکہ زیادہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں، اچھی بات ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اُردو کی اچھی کتابیں دیوناگری میں بھی بڑی کثرت سے شایع ہو رہی ہیں۔ اس روش کو اور ترقی دینا چاہئے لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اُردو کا اپنا، پرانا، آزمودہ، تاریخی اور صدیوں کے ریاض اور ذہن کا آئینہ دار رسم خط بدل دیا جائے۔ یہ خط اب ہندوستان کا ایک اہم خط ہے۔ اسے ابھی قومی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے اسے بھی ترقی کا موقع ملنا چاہئے۔

اِدھر اُدھر سے

۱۹۶۰ء میں سب سے زیادہ نئے اخبارات اردو میں نکلے

پریس رجسٹرار کی رپورٹ برائے ۱۹۶۰ء جس میں اخبارات سے متعلق اعداد و شمار اور ان کی اشاعت کے رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے اور جسے حال ہی میں پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا ہے، ظاہر کرتی ہے کہ پچھلے برسوں میں اخبارات کی تعداد میں اضافے اور تعداد اشاعت میں ترقی کا جو رجحان پایا جاتا رہا ہے وہ ۱۹۶۰ء میں بھی برقرار رہا۔

گزشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی انگریزی کے اخبارات کی تعداد سب سے زیادہ رہی یعنی ۱۶۷۴۔ اس کے بعد ہندی کے اخبارات کا نمبر رہا جن کی تعداد ۱۵۳۲ رہی۔ اخبارات کی تعداد کے اعتبار سے ان دونوں زبانوں کی حالت ۱۹۵۸ء سے بدستور یکساں چلی آرہی ہے۔ دیگر زبانوں کے اخبارات کی تعداد یوں تھی: آسامی ۱۶، بنگالی ۵۲۶، گجراتی ۵۱۹، کنڑ ۲۱۰، ملیالم ۱۹۹، مراٹھی ۴۴۴، اڑیا ۶۷، پنجابی ۱۳۸، سنسکرت ۱۲، تامل ۳۷۷، تلگو ۲۵۶، اردو ۶۸۰، دو زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد ۷۸۴ تھی۔

سب سے زیادہ تعداد میں اخبارات مہاراشٹر سے شائع ہوئے جن کی تعداد ۱۲۶۷ رہی۔ اس کے بعد مغربی بنگال کا نمبر رہا جس کے اخبارات کی تعداد ۱۰۰۰ تھی۔ اتر پردیش میں اخبارات کی تعداد ۱۰۰۲ تھی جبکہ دوسری ریاستوں میں:—

آندھرا پردیش ۳۰۹، آسام ۶۱، بہار ۱۹۵، گجرات ۴۴۱، کیرالا ۳۳۴، مدھیہ پردیش ۲۹۴، مدراس ۶۰۷، میسور ۳۱۰، اڑیسہ ۱۳۹، پنجاب ۵۸۴، راجستھان ۲۵۲، دہلی ۷۴۵، ہماچل پردیش ۴، منی پور ۲۶، تری پورہ ۱۲، جزائر انڈمان و نکوبار ۳۔

کل تعداد اشاعت اور زبان وار تقسیم

۱۹۶۰ء کی بابت ۸۰۲۶ اخبارات سے سالانہ بیانات موصول ہوئے ان میں سے ۴۶۷۱ اخبارات کی تعداد اشاعت کے بارے میں اعداد و شمار دستیاب ہوئے۔ ان کی کل تعداد اشاعت ۱۸۲ لاکھ ۱۹ ہزار تھی۔ اخبارات کی زبان وار تقسیم کے اعتبار سے اشاعت کی تعداد حسب ذیل رہی:—

انگریزی ۴۷.۰۴ لاکھ، ہندی ۳۱.۸۳ لاکھ، آسامی ۰.۳۷ لاکھ، بنگالی ۱۵.۹۴ لاکھ، گجراتی ۱۷.۱۲ لاکھ، کنڑ ۹.۴۰ لاکھ، ملیالم ۱۳.۰۱ لاکھ، مراٹھی ۱۷.۱۰ لاکھ، اڑیا ۱.۹۳ لاکھ، پنجابی ۳.۰۲ لاکھ، سنسکرت ۰.۰۷ لاکھ، تامل ۲۶.۰۹ لاکھ، تلگو ۷.۳۱ لاکھ اور اردو ۱۱.۵۵ لاکھ۔

۱۹۶۰ء میں روزناموں کی جملہ تعداد ۴۶۵ تھی جس میں ہندی روزناموں کی تعداد سب سے زیادہ تھی یعنی ۱۱۹۔ اس کے بعد اردو کا نمبر تھا جس میں روزناموں کی تعداد ۷۳، انگریزی روزناموں کی تعداد ۵۰، مراٹھی کی ۳۴، گجراتی کی ۳۵، ملیالم کی تیس، تامل کی ۲۶، تلگو کی ۱۴، پنجابی کی ۱۳، بنگالی کی سات اور اڑیا کی پانچ تھی۔ علاوہ ازیں مختلف زبانوں میں تین اخبار ہفتہ میں دوبار اور تین بار شائع ہوتے تھے۔ دس اخبارات اپنے اتوار کے ایڈیشن علیحدہ نکالتے تھے جن میں سات انگریزی کے تھے۔

روزناموں کی تعداد اشاعت میں ۶.۹ فی صد اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں ۳۱۳ روزناموں کی مجموعی تعداد اشاعت جس کے بارے میں اعداد مل سکے ہیں، ۶۴ لاکھ دس ہزار تھی۔ اس کے علاوہ دس اتوار کے ایڈیشنوں کی کل اشاعت ڈھائی لاکھ تھی۔

سب سے زیادہ تعداد اشاعت انگریزی اخبارات کی تھی ساڑھے گیارہ لاکھ۔ اس میں وہ ۲۳ اخبارات بھی شامل ہیں جن کی سنہ ۱۹۵۹ء کی تعداد اشاعت کے علاوہ دستیاب ہوئے۔ دوسری زبانوں کے روزناموں کی تعداد اشاعت حسب ذیل تھی:—

نام زبان	اخبارات کی جملہ تعداد جن کے اعداد و شمار ملے	کل تعداد اشاعت
۱۔ آسامی	۱	پانچ ہزار
۲۔ بنگالی	۱۰	دو لاکھ دس ہزار
۳۔ گجراتی	۲۶	تین لاکھ ۳۵ ہزار
۴۔ کنڑ	۳۰	ایک لاکھ ۵۵ ہزار
۵۔ ملیالم	۲۶	۴ لاکھ ۹۹ ہزار
۶۔ مراٹھی	۲۴	۳ لاکھ ۹۱ ہزار
۷۔ اڑیا	۵	۵۸ ہزار
۸۔ پنجابی	۹	۴۹ ہزار
۹۔ تامل	۲۰	۴ لاکھ ۷۸ ہزار
۱۰۔ تلگو	۱۳	ایک لاکھ ۶۳ ہزار
۱۱۔ اردو	۴۲	۲ لاکھ ۱۵ ہزار

دیوانِ غالب پنجابی رسم الخط میں

حکومت پنجاب کے محکمۂ لسانیات نے اردو کے عظیم شاعر غالب کا دیوان پنجابی رسم الخط میں چھاپا ہے۔ اس محکمے نے پنجابی گرمکھی بھی چھاپی ہے جو دو انگریزوں (گراہم بیلی اور نیوٹن) کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ ایک اور اہم کتاب پنجابی انگریزی کے تحت چھاپی گئی ہے جو ایک انگریز جوکس نے ترتیب دی ہے۔

سنسکرت تصانیف کے عربی اور فارسی ترجمے

سائنسی تحقیق و ثقافتی امور کے مرکزی وزیر پروفیسر ہمایوں کبیر نے راجیہ سبھا میں بتایا کہ "شکنتلا" کے عربی ترجمے کی چھپائی شروع ہو گئی ہے اور توقع ہے کہ یہ کتاب مستقبل قریب میں شائع ہو جائے گی۔

وزیر موصوف نے اس بات کی تصدیق کی کہ کالیداس کی "وکرم اروشی" کا فارسی ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی میں "نل دمینتی"، "بھگوت گیتا"، "راماین"، "مہابھارت"، "بھارتی دیومالا" کے خلاصے کا ترجمہ ہو گیا ہے، صرف طباعت ہونا باقی ہے۔ ان کے علاوہ فارسی میں "بھگوت گیتا" اور "شکنتلا" کا ترجمہ اور سنسکرت فارسی گرامر بھی شائع ہو گئی ہے۔

عربی لغت کا قدیم ترین نسخہ

ابوالنصر اسمٰعیل ابن حماد کی مشہور عربی لغت کا قدیم ترین نسخہ جو سنہ ۱۱۲۶ ہجری میں بغداد میں نقل کیا گیا تھا آذربائیجان کی سائنس اکیڈمی نے حاصل کر لیا ہے۔

ابوالنصر کا قلمی نام جواہری تھا۔ اس لغت کو عربی لغات کا "تاج" کہا جاتا ہے۔ موجودہ نقل ان کے انتقال کے ۲۴۰ برس بعد کی ہے۔

مظہر امام

خیر طلب

یہ مانا کہ میں ایک ویران صحرا ہیں برباد ہوں
مجھ کو برباد رہنے دو
میری طرف یوں عنایت کی چشم ریا سے نہ دیکھو
مجھے اب بھی اس زہر کا ذائقہ یاد ہے
جو تم نے بڑی نرم سی مسکراہٹ کے ساغر میں حل کرکے مجھ کو دیا تھا!

شاد زیبائی بنگلوری

زبانِ اُردو

اللہ اللہ ہے کیا شانِ زبانِ اُردو
ایک عالم ہے ثنا خوانِ زبانِ اُردو
ہر طرف ہند میں مرغوب ہے مقبول ہے یہ
ساری قوموں پہ ہے احسانِ زبانِ اُردو
مشترک ہندو و مسلم کا یہ سرمایہ ہے
دونوں قومیں ہیں نگہبانِ زبانِ اُردو
اس میں ہے ہر گلِ تازہ کی بہارِ رنگیں
کتنا دل کش ہے گلستانِ زبانِ اُردو
صورتِ آئینہ حیران ہیں اربابِ نظر
دیکھ کر جلوۂ تابانِ زبانِ اُردو

محبوب نظر

اُردو

اتحادِ ہندو و مسلم کی زرّیں یادگار عظمتِ تہذیبِ بھارت کی مقدس شاہکار
تیرا ایک ایک حرف ہے تاریخ کا آئینہ دار تجھ سے وابستہ ہے دیرینہ محبت کا وقار
الفت و اخلاص کی اک پُرکشش تصویر ہے
اور کتابِ زندگی کی دلنشیں تفسیر ہے
ترکی، انگریزی، تامل، پرتگیزی، ناگری تیلگو، سنسکرت، بھاشا اور عربی فارسی
تو میں کس ناز سے اتنی زبانوں کی پلی تجھ کو دی شاہ جہاں نے وہ حیاتِ سرمدی
تیرے سر پر تو رہا ہے سایۂ سیف و قلم
صفحۂ گیتی پہ تو ہے بس مثالِ جامِ جم
تجھ میں اتنی خوبیاں ہیں اتنے اوصافِ حسیں تیرا اندازِ تکلم اس قدر ہے دلنشیں
اس قدر ہے لوچ تیری گفتگو میں نازنیں ساری دنیا کی زبانیں جذب ہو کر رہ گئیں
تو وہ اک اوصافِ حُسن کی منقش ہے صنم
مرجعِ شیخ و برہمن معبدِ اہلِ قلم

زکی کاکوروی

غزل

چلو چلیں کہیں قلب و نظر کی بات کریں
حیاتِ شوق و فغانِ سحر کی بات کریں
تعددِ دیر و حرم سے گزر چلیں آگے
نئے مقام، نئے راہبر کی بات کریں
نئی بہار، نیا گلستاں، نئی کلیاں
نئی روش کی، نئی رہگزر کی بات کریں
مٹا سکے نہیں کوئی کسی کی کیا ہستی
تو کیوں نہ حوصلۂ معتبر کی بات کریں
زکی یہ راہ کٹھن ہے، محال ہے منزل
نہیں بجا کہ کسی ہمسفر کی بات کریں

ناصر شہزاد

غزل

ہر چوٹ کو ہنس ہنس کے دلِ زار پہ سہہ لے
اے زندگی چاہت کی حسیں موج میں بہہ لے
احساس نہ ہو جائے کہیں مرگِ وفا کا
اک بار ہی لے دوست تو اپنا مجھے کہہ لے
ہے یاد مجھے آج بھی وہ صورتِ زیبا
مکھ روپ سجیل، ہونٹ مدھر، نین رسیلے
یہ کون مری سوچ میں چپکے سے در آیا
دیکھا یہ کسے دل نے نگاہوں سے بھی پہلے
اس دہر میں پھر لوٹ کے کون آیا ہے ناصر
دو دن کا ہے میلہ یہاں ہنس کھیل کے رہ لے

خانم ممتاز

غزل

بہت دعوے کئے ہیں آگہی نے
محبت کو نہیں سمجھا کسی نے
جبیں پہ خاک کے ذرّے نہیں ہیں
ستارے چن دیئے ہیں بندگی نے
اُنھیں بھی زندگی سے ہے شکایت
جنھیں سب کچھ دیا ہے زندگی نے
ہزاروں داغِ دل روشن کئے ہیں
تمہاری یاد کی رخشندگی نے
نہ پوچھو ہم سے کیا کیا گل کھلائے
چمن میں اُن کی آہستہ روی نے
خدا غارت کرے دستِ ستم کو
ابھی تو آنکھ کھولی تھی کلی نے
رہِ ظلمت کو ضو بخشی ہے ممتاز
ہمارے آنسوؤں کی روشنی نے

ہمراز اکبر آبادی

غزل

میں کہ رہرو رہِ عشق ہوں کہاں میرے دل کو قرار ہے
کبھی رو برو غمِ دو جہاں کبھی سامنے رُخِ یار ہے
گل و بلبل و سمن و ثمر ہیں فسردہ آج بھی نکہتیں
یہ اگرچہ سب کو یقین ہے کہ چمن میں چھائی بہار ہے
ہے جنونِ شوق پہ منحصر یہی کیف و بیخودی میکشو
نہ کوئی شراب شراب ہے نہ کوئی خمار خمار ہے
دلِ بے قرار میں ہے نہاں اک حسین رازِ حیات کا
مرے پاس آ غمِ عشق تو مرے دل کو آج قرار ہے
شبِ ہجر میں تری یاد بھی مرے دل میں آتی ہے اس طرح
کوئی راہرو ہے تھکا تھکا سا اور ایک جلا دیار ہے
اگر ایک ساتھ چلیں گے ہم تو کھلیں گے لاکھ وفا کے گل
ترے حُسن پر بھی شباب ہے مرا دل بھی باغ و بہار ہے
گریں بجلیاں مرے قلب پر چلیں لاکھ رنج کی آندھیاں
مجھے غم نہیں مجھے ڈر نہیں مرے پاس میرا نگار ہے

مراسلات

ہندی ماترائیں اور اُردو اعراب

مذکورہ بالا عنوان سے میرا جو مضمون "ہماری زبان" کے ۲۰؍ جون ۱۹۶۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا اس کے متعلق جناب غلام رسول صاحب نے ۱۵؍ جولائی کے ہماری زبان میں چند تنقیحات قائم کی ہیں۔ ممکن ہے یہ غلط فہمیاں طباعت اور کتابت کی ان غلطیوں کے باعث ہی پیدا ہوئی ہوں جن کی تصحیح اس شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ موصوف نے اپنے تبصرہ میں کچھ ایسی بھی باتوں کا ذکر کیا ہے جن کا طباعت کی غلطیوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے لہٰذا تبصرہ میں قائم کی گئی تنقیحات کا میں ترتیب وار حسب ذیل جواب سپرد قلم کر رہا ہوں۔

۱-۲۔ واقعی ہندی اور اُردو رسم الخط میں کوئی مناسبت نہیں ہے اور نہ میں مناسبت لانا ہی چاہتا ہوں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مختلف رسم الخط کی صورت میں بھی اگر کسی دو زبانوں کے حروف صحیح اور حروف علت کی آوازوں میں مطابقت ہو تو ہم ان میں سے کوئی ایک زبان جان کر دوسری زبان آسانی سے نہیں سیکھ لیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جہاں ہم کسی لفظ کی اُردو تحریر میں ا، زیر، ی، پیش، و اور ے، وغیرہ لکھتے ہیں وہاں ہندی میں ترتیب وار आ، ऊ، ऐ، ि اور ृ وغیرہ کی ماترائیں استعمال کرتے ہیں، اور اس طرح لکھی ہوئی ہندی ۹۵ فی صدی صحیح ہوتی ہے۔ حالانکہ اکثر وہ ہندی داں بھی جو اُردو نہیں جانتے آئے دن اس طرح کی غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔

ہاں، میں مانتا ہوں کہ وہ ہندی الفاظ جو ہندی کے ساکن اور مخلوط حروف صحیح (ष्ट، त्र، ज، क्ष) سے لکھے جاتے ہیں اُردو داں اُردو ہجے کے انداز پر اس وقت تک صحیح صحیح نہیں لکھ سکتے جب کہ اس کے لئے کوئی نئی صورت نہیں نکال لی جائے۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو محض معمولی علامتوں سے ہی ہندی اور انگریزی کے غیر مانوس الفاظ کو بھی صحت کے ساتھ لکھ پڑھ سکتے ہیں بہر دست ہمارا موضوع بحث صرف حروف علت ہی ہے۔ جب دوسری زبانوں کے غیر مانوس الفاظ کو صحت کے ساتھ اُردو میں لکھنے اور پڑھنے کا موضوع زیر بحث آئے گا تب اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اظہار خیال کا اچھا موقع مل جائے گا۔ میرا تو دعویٰ ہے کہ اگر صرف حروف علت کے متعلق ہماری چند غلط فہمیوں کی ہی اصلاح ہو جائے تو ہم صرف ہندی حروف کو پہچان کر آسانی سے ہندی لکھ پڑھ سکیں گے۔

۳۔ صنعت مقطع اُردو کے لئے کوئی اجنبی چیز نہیں ہے۔ آج بھی ہم بہت سے الفاظ (اُردو، درود، دری، روزی) انفرادی صورت میں لکھتے ہی ہیں۔ اگر ہمیں انفرادی صورت میں (صرف طباعت کے لئے) اُردو لکھنا منظور نہیں ہے تو ہمیں سستا ٹائپ رائٹر تیار کرنے کے لئے کوئی دوسری صورت نکالنی چاہئے ورنہ ہمارا یہ خواب کہ ہم اپنے مضامین ٹپ ٹپ چھاپ کر چھپنے کے لئے پریس میں بھیج دیں گے کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ انگریزی پہلے ٹائلس حرف میں ایک ہی ساتھ لکھی جاتی تھی لیکن طباعت کی دقتوں نے ہی انگریزی داں کو حروف الگ الگ چھاپنے اور ایک ساتھ ملا کر لکھنے کے لئے مجبور کیا اور آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انگریزی زبان میں چار طرح کے حروف مروج ہیں اور کسی بھی انگریزی داں کو دونوں طرح کی تحریر پڑھنے میں دقت نہیں ہوتی۔

میں مانتا ہوں کہ ابتداء میں ہمیں یہ طریقہ اجنبی معلوم پڑے گا لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ہم دونوں طرح کی تحریر پڑھنے کے عادی ہو جائیں گے۔ چونکہ ہمارے بچے ابتداء سے ہی اُردو کی ان دونوں طرز تحریر سے واقف ہوں گے اس لئے ان کے لئے دونوں طرح کی لکھاوٹ پڑھنے یا لکھنے میں دقت نہیں ہوگی۔

چونکہ مجوزہ طریقہ کے مطابق اُردو موجودہ ترقیمی صورت میں بھی لکھی جائے گی اس لئے ہم اپنے قدیم علمی ذخیرہ سے اسی طرح فائدہ اُٹھاتے رہیں گے جس طرح آج اُٹھا رہے ہیں اور فارسی و عربی کی کتابوں کو بھی پڑھنے میں کسی طرح کی نئی دشواری نہیں ہوگی۔

بہر حال جو بھی ہو میرا موضوع بحث یہ بھی نہیں ہے۔ یہ ایک ٹکنیکل مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ پر متعلقہ تجربہ کار حضرات کو ہی غور کرنا چاہئے میں نے صرف سستا ٹائپ رائٹر تیار کرنے کے لئے ہی یہ سجھاؤ اُردو داں حضرات کے سامنے رکھا ہے۔ اُردو ایک ترقی پذیر زبان ہے۔ یہ قدیم تاریخی نہج کی پابند نہیں ہے۔ اس نے کبھی بھی اچھی باتوں کی تقلید سے گریز نہیں کیا ہے ورنہ آج اُردو میں بھ، پھ، تھ...... وغیرہ ہندی کے حروف اور دوسری زبانوں کے ہزاروں الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔

۴۔ مجوزہ اُردو اعرابی بدل بالکل موزوں ہے۔ اس میں ہندی کی مطلق تقلید نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ زیادہ تر اُردو کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس سے اُردو زبان کی سالمیت بالکل برقرار رہتی ہے۔ یہ طریقہ تو محض ہماری چند غلط فہمیوں (حروف علت اور اعراب کے متعلق) کی ہی اصلاح کرتا ہے۔ اگر آپ غور فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ یہ اعرابی بدل اُردو زبان کو بالکل قابل فہم اور سہل الحصول بنا دیتا ہے۔ کیونکہ آج جہاں ہمارے بچے "کوٹ" کو कूट، कौट، कोट اور "بیل" کو बेल، बील اور बैल بھی پڑھ سکتے ہیں وہاں کل وہ قطعی طور پر وہی پڑھیں گے جو لکھیں گے جیسا کہ نئے قاعدہ سے لکھے ہوئے الفاظ کو میں نے مضمون میں لکھا ہے۔

اُردو زبان میں تشدید اور سارے مجوزہ کوئی اعراب نہیں ہے تشدید میں کسی طرح کی آواز نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی علامت ہے جو اپنے سے پہلے اور بعد والے حرف کو ملا کر پڑھنے کے لئے مجبور کرتی ہے اور جزم بھی اسی طرح کی ایک دوسری علامت ہی ہے۔

[illegible] اور [illegible] کے لئے چارٹ میں اُردو اعراب بنائے گئے ہیں۔ ہندی کے अं کے لئے میں نے نون غنّہ ہی تجویز کیا ہے۔ البتہ आ کے لئے ہی میں نے ہندی کی تقلید کی ہے، کیونکہ میں اُردو زبان میں اتنی وسعت پیدا کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں یہ عربی اور فارسی کے تمام الفاظ کا صحت کے ساتھ تلفظ کر سکتی ہے وہاں یہ اپنے ہی ملک میں بولے جانے والے الفاظ کو بھی صحیح صحیح بول سکے۔ پھر بھی چونکہ ہندی میں بھی (اَو یہ ﺍﻭ :) کا بہت کم استعمال ہوتا ہے اس کے لئے اس علامت کو چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ اس کو چھوڑ دینے سے ہمارے اعرابی عمل پر کسی طرح کا اثر پڑتا ہے۔ (ایم۔ اے۔ حسن پھپھوندوی)

تاریخ داستان اُردو طبع دوم

(مولفہ مولوی حامد حسن قادری)

تاریخ داستان اُردو کا سرسری مطالعہ کر رہا تھا تو مندرجہ ذیل غلطیوں پر نظر پڑی۔ ناظرین ہماری زبان کی آگاہی کے لئے غلطیوں کی اصلاح درج ذیل ہے۔

ص ۸۹

"(باغ و بہار کے علاوہ) میر امّن دہلوی کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے۔ یہ مُلّا حسین واعظ کاشفی (مصنف انوار سہیلی) کی اخلاق محسنی کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بھی ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے باغ و بہار کے بعد ۱۸۰۲ء میں لکھی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کو چھپوایا بھی نہیں۔ مدتوں بعد ۱۸۷۰ء (۱۲۹۰ھ) میں مطبع محبوب بمبئی میں چھپی۔ اس کا ایک بوسیدہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں ملا ہے۔"

مولوی حامد حسن قادری نے عدم واقفیت کی بنا پر ایسا لکھا ہے۔ گنج خوبی کا ایک ایڈیشن مطبع احمدی کلکتہ سے ۱۸۴۶ء ۱۲۶۲ھ میں بڑی تقطیع کے ۴۶۲ صفحوں میں شائع ہوا تھا اس کی ایک کاپی خدا بخش لائبریری پٹنہ کے الاصلاح لائبریری دسنہ سیکشن میں محفوظ ہے۔

ص ۲۱۲

"(۲) (غالب نے) قاطع برہان میں خان آرزو کی برہان قاطع کے اغلاط ثابت کئے ہیں۔"

برہان قاطع کے مصنف خان آرزو نہیں بلکہ مولوی محمد حسین ابن خلف التبریزی متخلص بہ برہان ہیں۔

ص ۲۱۳

"(۳) اُردوئے معلیٰ حصہ دوم ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا تھا۔"

اردوئے معلیٰ حصہ دوم جو مطبع مجتبائی سے ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا تھا وہ علیٰحدہ نہیں شائع ہوا تھا بلکہ حصہ اوّل کے ساتھ ہی ایک ہی ٹائٹل پیج میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ خاکسار کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

ص ۲۷۰

"آثار الصنادید کا تیسرا ایڈیشن منشی رحمت اللہ رعد نے اپنے نامی پریس کانپور سے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا جس میں پہلے دونوں (اوّل و دوم) ایڈیشنوں کی خوبیاں جمع کر دیں۔"

سرسیدؒ کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے بعد آثار الصنادید کا تیسرا اور چوتھا ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ رحمت اللہ رعد کا پانچواں ایڈیشن ہے اس میں سب سے بڑی کمی تو یہ ہے کہ پہلے ایڈیشن میں جو مشاہیر دہلی کے حالات سرسید نے لکھے تھے وہ اس ایڈیشن میں حذف کر دئے گئے ہیں۔ (محمد بشیر الحق دسنوی بہاری)

مولوی عبدالحق صاحب کا انتقال

۱۰ راگست ۱۹۶۱ء کے اخبار میں پڑھا کہ ۱۰ راگست ۶۱ء کو ڈاکٹر عبدالحق کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب جس نسل کے آدمی تھے اس نسل نے بڑے بڑے کام کئے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنے ذمہ ایک بڑا کام لیا تھا۔ اس کام کو پورا کرنے کی ان کے اوپر اس درجہ دھن سوار تھی کہ نوّے سال کی عمر بھی انھیں کام سے الگ نہیں کر سکی۔ اب موت نے انکو کام سے الگ کیا ہے۔ سرسید کی آنکھوں کی روشنی، حالی کی دلسوزی اور عبدالحق کی جفاکشی سے ترکیب پاکر جو شخصیت ایک عرصہ تک گیسوئے اُردو کو سنوارنے کے نقشے بناتی رہی وہ اب نہیں رہی، اسکی حسرتوں کا افسانہ رہ گیا ہے۔ اس افسانہ کی اہمیت محسوس کرنے والوں کو مولانا عبدالحق کے اردو کے پیار کی ایک ایسی تصویر بنانی ہے جسے اس سائنسی دور میں تصویر کہا جائے، اسی کو مولانا کی یادگار کہا جائے گا۔

(حسن عسکری بلکھنوی)

تصحیح

ہماری زبان ۲۲ جون ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں زیر عنوان "ہندی ماترائیں اور اردو اعراب" کی طباعت اور کتابت میں بعض غلطیاں رہ گئی تھیں جن کی حسب ذیل تصحیح کی جاتی ہے:۔

صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۲	۲	۴	غلت	صحیح
٭	۱	۱۹ چارٹ	ے	ئے
٭	۲	۱۰	کو	کوُ
٭	۲	۱۰	کی	کن
٭	۲	۱۴	ک س ان	کِ س ان
٭	۲	۱۴	کیسان	کیسان
٭	۲	۱۶	کیلا	کیلا
٭	۲	۱۷	کیلاش	کیلاش
٭	۲	۱۷	تھوڑا	تھوڑا
٭	۲	۱۸	چوکی	چوکی
٭	۲	۲۳	اُو	اَو
٭	۲	۲۴	ا + وُ	اوُ
٭	۲	۲۸	آ	آ
٭	۲	۳۰	اُوتار	اَوتار
٭	۲	۳۱	اوردھ	اَوردھ

(ایم۔ اے۔ حسن پھپھوندوی)

انجمن کا خبرنامہ

وزیر اعلیٰ اترپردیش سے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے وفد کی ملاقات

کان پور کی کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ انجمن کا ایک وفد اترپردیش کی حکومت سے ملے اور اس کے سامنے اپنے مطالبات رکھے۔ چنانچہ ۱۰ اگست ۱۹۶۱ء کو انجمن ترقی اُردو (ہند) کے وفد نے وزیر اعلیٰ اترپردیش جناب چندر بھان گپتا سے ملاقات کی۔ اس وفد کی قیادت کرنل بشیر حسین زیدی صدر انجمن ترقی اُردو (ہند) نے کی۔ وفد میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور کے علاوہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، پنڈت سندر لال، مولانا حفظ الرحمٰن، حیات اللہ انصاری، بشمبر ناتھ پانڈے اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب شامل تھے۔ وفد نے وزیر اعلیٰ کی خدمت میں اترپردیش میں اُردو کو اس کا جائز مقام دینے کے لئے تجاویز ایک عرضداشت کی شکل میں پیش کیں۔ وزیر اعلیٰ سے گفتگو تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ وہ اُردو کو کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں سمجھتے اور انھوں نے وفد سے بھی اپیل کی کہ بطور ایک مشترکہ زبان اس کی بقا کے لئے کام کرے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ لسانی کمیٹی ایسی سفارشیں حکومت کو پیش کرے گی جس سے اُردو دوستوں کو اطمینان ہوگا اور اُن کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں دور ہوں گی۔

اُردو رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ دہلی

سال گزشتہ دہلی کے اُردو ادیبوں کی متفقہ کوشش سے ایک کوآپریٹو سوسائٹی کا قیام ہوا تھا اور یہ "اُردو رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ دہلی" کے نام سے جاری ہے۔ اس کا بنیادی خیال جناب مالک رام، سورگیہ جناب شوراج بہادر، جناب جگن ناتھ آزاد اور شری کیلاش چندر جیسے مخلصین کے ذہن میں آیا تھا۔ اب یہ سوسائٹی باضابطہ رجسٹرڈ ہو چکی ہے، اور دہلی کے (۲۲) ادیب اس کے ممبر اور حصہ دار ہیں۔ اسکے اغراض و مقاصد یہ ہیں:-

(الف) دہلی کے اُردو ادیبوں کی بہترین تخلیقات کو اعلیٰ پیمانے پر چھاپنا۔

(ب) اُردو کے بہترین ادب کو دوسری علاقائی زبانوں سے روشناس کرانا اور دوسری زبانوں کے اچھے ادب کو اُردو میں منتقل کرنا۔

(ج) اُردو میں تحقیق و تنقید کا اعلیٰ معیار قائم کرنا۔ قدیم مخطوطات کی فراہمی اور ان کی ترتیب و طباعت۔

اس کے علاوہ ایک علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ نکالنے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔ سوسائٹی ایک سال سے نہایت خاموشی کے ساتھ کام کر رہی ہے اور اس کی رفتار اطمینان بخش ہے۔ اس کے سلسلۂ مطبوعات کی پہلی کتاب جناب غلام ربانی تاباںؔ کا مجموعۂ کلام "حدیثِ دل" منظر عام پر آچکا ہے اور دوسری چند کتابیں بھی امید ہے اس سال کے آخر تک شائع ہو جائیں گی۔

سوسائٹی کے عہدے داروں کی تفصیل یہ ہے جو اس سال کے جلسۂ عام میں منتخب ہوئے ہیں:-

صدر: جناب غلام ربانی تاباں، نائب صدر: ڈاکٹر قمر رئیس، جنرل سکریٹری: ظل عباس عباسی، جوائنٹ سکریٹری: نثار احمد فاروقی، خزانچی: گوپی چند نارنگ،

مجلس منتظمہ میں: جگن ناتھ آزاد، شری کیلاش چندر، رشید حسن خاں، خلیق انجم، ہنس راج رہبر اور اسلم پرویز شامل ہیں۔

(سکریٹری)

انجمن اُردو پرائمری اسکول کنگھورا کو دو ہزار روپے کا عطیہ

جن پد سبھا کنگھورا (ضلع بلاسپور) نے انجمن اُردو اسکول (اجرا ۲۶-۱-۶۱) کنگھورا کو بطور عطیہ دو ہزار روپے کی رقم ادا کی ہے۔ شری بنواری لال ایم۔ایل۔اے چیرمین جن پد سبھا کنگھورا مستحق مبارکباد ہیں، انھوں نے یہ رقم جن پد سبھا سے دلاکر اُردو دوستی و جمہوریت نوازی کی مثال قائم کی۔ (نامہ نگار)

بزم سرمد (پٹنہ) کی ادبی سرگرمیاں

وسط مارچ ۱۹۶۱ء میں "بزم سرمد" قائم ہوئی۔ اس کی پہلی نشست ۲۱ اپریل کو یوم اقبال کے موقع پر ہوئی۔ مئی و جون میں چند مشاعرے ہوئے۔ شاعروں اور مضمون نگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ زبان، رجحانات اور خیالات کے تبادلہ کے ساتھ ساتھ ادب اور سماج کی اصلاح ہوئی۔ چند نوجوان آگے بڑھے۔ اور آج ایک ماہ سے باضابطہ طور پر "بزم سرمد" کے اراکین ہر ماہ ایک غیر طرحی مشاعرہ کر رہے ہیں، اور اُردو زبان و ادب کو ترقی پر گامزن کرنے کے واسطے ہمارے مدد و معاون ہیں۔ یوم آزادی کے موقع پر ۱۴ اگست ۱۹۶۱ء کی شب کو ایک مشاعرہ ہوا۔

(مسعود عالم معتمد)

بنگلور میں مشاعرہ

۱۰-۱۱ اگست ۱۹۶۱ء کو "بن فرینڈس" سوسائٹی کی جانب سے ٹاؤن ہال بنگلور میں دو روز ٹکٹ سے ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مندرجۂ ذیل مقبول شعراء نے شرکت کی۔

مجروحؔ سلطانپوری، ڈاکٹر شفاؔ گوالیاری، ارشدؔ صدیقی، پریم وار برٹنی، مظفرؔ شاہجہاں پوری، شمیمؔ جے پوری، صباؔ افغانی، محترمہ صہباؔ حیدر آبادی، محترمہ مینا قاضی، منشی منتقہ، کفیل آزر، کاوش بدری، فضا کوثری، دانش فرازی وغیرہ۔

(محمود ذکریا۔ مہتمم مشاعرہ بن فرینڈس سوسائٹی منگلور)

مولوی عبدالحق کی خدمات کو خراجِ عقیدت

اُردو ہال میں تعزیتی جلسہ

حیدرآباد۔ ۲۰ راگست۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کے سانحۂ ارتحال پر رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے آج شام اُردو دوستوں کے ایک عظیم اجتماع میں ان کی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ انجمن ترقی اُردو، ادارۂ ادبیاتِ اُردو، اور اُردو مجلس کی جانب سے مشترکہ تعزیتی جلسہ اُردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر غلام یزدانی نے کی۔ جلسہ میں ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔ اس تعزیتی جلسہ کو پروفیسر ہارون خاں شیروانی ایم ایل سی، رائے جانکی پرشاد صدر اُردو مجلس، مسٹر حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اُردو، پنڈت ونشی دھر ودیالنکار اور مسٹر غلام ربانی اور پروفیسر سید محمد کے علاوہ دوسروں نے مخاطب کیا۔ مقررین نے بابائے اُردو کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم ہو گئی۔ مولوی صاحب کا علمی تجربہ، صحیح ذوق، تلاش اور تحقیق کا شوق، ایسی صفات تھیں جن کی وجہ سے آج ہند و پاک کے اُردو داں عوام سوگوار ہیں۔ مولوی صاحب سیاست سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔

مسٹر حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اُردو حیدرآباد نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کی خدمات کی ستائش کی اور کہا کہ مولوی صاحب نے (۹۰) سال سے زیادہ عمر پائی لیکن اتنی طویل عمر پا کر انتقال کرنے کے بعد بھی اُردو کے شیدائیوں کی یہ تمنا تھی کہ مرحوم کو اور عمر ملے۔ مولوی صاحب کی زندگی سبق آموز ہے۔ ملک کے ہر بچے اور بوڑھے کو ان کی زندگی سے سبق حاصل کر کے عمل کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب پاکستان پہنچے تو پاکستان میں انھوں نے ابتدائی زندگی ایک قیدی کی طرح گذاری۔ انھوں نے ایسی زندگی بسر کی کہ پریشانی اور تکالیف کے دوران انھوں نے اپنی تصانیف تک کو فروخت کر ڈالا۔

مولوی صاحب کی حیدرآباد سے دلچسپی کا تذکرہ کرتے ہوئے مسٹر حبیب الرحمٰن نے کہا کہ حقیقت میں عثمانیہ یونیورسٹی کا اصل بانی عبدالحق ہی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلے میں دارالترجمہ کا قیام اور اس کو کامیابی سے چلانا ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ پاکستان میں آخری لمحے تک اُردو یونیورسٹی کا نعرہ بلند کرتے رہے۔

رائے جانکی پرشاد صدر اُردو مجلس نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کی خدمت اس کے تحفظ اور ترقی کے لئے مولوی صاحب ہمیشہ موزوں میدانِ عمل کی تلاش میں رہے ہیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ اُردو کو ساری دنیا کی زبان بنا دیتے۔ اسی جذبہ سے وہ ملک کے گوشے گوشے میں آخری لمحہ تک دورے کرتے رہے۔ آج ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اُردو کی تہذیب اور مثالی رواداری کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں جس کی بنیاد مولوی صاحب نے ڈالی ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی جانب سے پروفیسر سید محمد نے مولوی عبدالحق صاحب نے لسانیات اور دکنیات کی جو خدمت انجام دی ہے اس کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ حیدرآباد میں اپنے قیام کے دوران .... مولوی صاحب نے اُردو زبان کے، کھنی دور کو زندہ کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد دارالترجمہ کے ناظم مقرر ہوئے آج ان کی موت پر .... حیدرآباد میں اپنے ایک عظیم محسن کی جدائی پر افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے بابائے اُردو کے انتقال پر اُردو زبان کو یتیم اور بے سہارا قرار دیا اور کہا کہ ایک مدت تک ایسے ایثار و قربانی کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوگا۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ہند، پاک مشترکہ طور پر مولوی عبدالحق کی یاد تازہ رکھنے کو تہذیبی ادبی پروگرام تشکیل دینا چاہیئے۔ انھوں نے دونوں ممالک کے اُردو کے مفکرین سے اپیل کی کہ وہ مولوی صاحب کی سوانح حیات کو مرتب کر کے انھیں زندۂ جاوید بنا دیں اس میں ہندی دوست بھی شریک رہیں، کیونکہ مولوی صاحب کو ہندی سے بھی شغف تھا۔

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار نے کہا کہ مولوی عبدالحق صاحب کے انتقال سے نہ صرف اُردو زبان کو بلکہ دوسری ہندوستانی زبانوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ وہ اُردو یونیورسٹی کے قیام کے خواہاں تھے اور اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اُردو کے لئے جو خواب دیکھے وہ پورے ہو چکے۔

مسٹر غلام ربانی نے مولوی صاحب کی اُردو خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا، اور کہا کہ انھوں نے اورنگ آباد سے اُردو کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا اور آخری عمر تک یہ کام انجام دیتے رہے۔

پدما بھوشن ڈاکٹر غلام یزدانی نے اپنی صدارتی تقریر میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کی اُردو خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ مرحوم نے اُردو زبان کو قصہ گوئی، مذہبی روایت اور گیتوں کی زبان سے نکال کر علمی اور ادبی زبان تک پہنچا دیا جس کا ثبوت جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ (حبیب الرحمٰن)

انجمن ترقی اُردو شاخ کھڑگپور کا تعزیتی جلسہ

مورخہ ۱۰ راگست ۱۹۶۱ء کو جناب محمد حنیف روشن کی صدارت میں انجمن ترقی اُردو شاخ کھڑگپور کی جانب سے بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کی وفات حسرت آیات پر اظہارِ غم کے لئے ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں انجمن کے جنرل سکریٹری اور جناب روشن صاحب نے بابائے اُردو کے حالاتِ زندگی نیز ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور ایک تعزیتی تجویز پاس کی۔

(عبدالغنی کوثر پرتاب گڑھی سکریٹری نشر و اشاعت)

احمد رضی سیما مجددی

"ڈاکٹر اقبال اور تصوف"

جس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی مشہور مثنویات "اسرار خودی" "رموز بے خودی" کے ترجمے یورپ میں شائع ہوئے، ہندوستان میں "تصوف" پر ایک عجیب غریب قسم کی بحث چھڑ گئی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ بحث تصوف کی بحث نہیں تھی بلکہ پنجابی اور غیر پنجابی کا وہی پرانا جھگڑا تھا جو اس سے پہلے مختلف رنگ و روپ میں متعدد بار سامنے آچکا تھا۔ اس وقت کی ادبی دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی، ایک کی سربراہی دلّی کے صاحب طرز انشاء پرداز خواجہ حسن نظامی کر رہے تھے، اور دوسرے کی رہنمائی شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال۔

بحث کچھ زیادہ اونچے قسم کی عالمانہ تھی لیکن دلّی اور لاہور کے اخبارات نے اس بحث میں کچھ ایسی ناگوار تلخیاں گھول دی تھیں کہ بات ذاتیات تک جا پہنچی۔ اکبر الہ آبادی خواجہ حسن نظامی کے ہم خیال تھے، اور انھوں نے اپنے مخصوص رنگ میں اس بحث میں کافی حصہ لیا تھا چنانچہ ان کے اس مشہور قطعہ کا پس منظر یہی بحث ہے۔

مولوی ہو ہی چکے تھے نذر کالج اس سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام
لکچر و مضمون لکھتے ہیں تصوف کے خلاف
الوداع اے ذوقِ باطن، الوداع اے فیضِ عام۔

اکبر فطری طور پر "صلح پسند" انسان تھے۔ تصوف کی اس بحث میں انھیں ڈاکٹر اقبال سے غالباً یہ شکایت تھی کہ ان مثنویات میں تصوف کے جو مسائل حل کئے گئے ہیں انھیں یورپ والے نہیں سمجھ سکتے اور اسی لئے ان مثنویات پر ان کا تنقیدی تجزیہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اکبر کے ان جذبات کے محرک دراصل پنجابی اخبارات کے وہ مضامین تھے جن میں شاعر مشرق کے متعلق مغربی مفکرین اور تنقید نگاروں کے خیالات کو اہمیت دے کر شائع کیا گیا تھا۔ چنانچہ اکبر نے کہا ہے۔

رقیب سارٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

لیکن اکبر اس اخباری جنگ کو کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے انھوں نے تصوف کی اس جنگ کو ختم کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا جس کا اقرار خود خواجہ حسن نظامی نے اپنے ایک مضمون "جناب اقبال و حسن نظامی" میں کیا ہے:-

"گذشتہ ایام میں جناب شیخ اقبال صاحب بیرسٹر پی ایچ ڈی اور حسن نظامی کے درمیان مسئلۂ تصوف میں اختلاف واقع ہوا تھا، گفتگو آگے بڑھتی مگر ایک طرف تو جناب ڈاکٹر صاحب کو حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی نے روکا اور دوسری جانب مجھ کو بھی ممانعت فرمائی۔ میں حضرت اکبر کی ذات کو اپنا مرشد معنوی تصور کرتا ہوں اس لئے اس گفتگو سے دست بردار" ہو گیا اور خلقت کی اس شہرت کو برداشت کرتا رہا کہ حسن نظامی اقبال سے علمی بحث نہ کر سکا کیونکہ یہ بدنامی بہتر تھی اپنے رہنمائے روح کی عدم تعمیل ارشاد سے۔"

(ہفت روزہ "خطیب" دہلی ۲۲ جنوری ۱۹۱۸ء شمارہ ۳، ۴، ۵۔ جلد نمبر ۲)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یہ ادبی جنگ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے لیکن یہ ناگوار بحث جس صلح جویانہ فراخدلی کے ساتھ ختم ہوئی، "اقبالیات" کے موضوع کی ایک اہم کڑی ہے جس سے نہ محض ڈاکٹر اقبال کے کردار کی بلندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ خواجہ حسن نظامی کی صلح کوشی اور صلح جوئی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس بحث کو ختم کرنے کے لئے خواجہ حسن نظامی نے اقبال کو جو خط لکھا تھا وہ ایک اہم تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس خط میں لکھا تھا۔

"محب الفقرا جناب شیخ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب سلام علیکم

آج مجھ میر نیرنگ صاحب کے خط نے مجھے ایک بڑے مغالطے سے بچا لیا اور میں ان کا از حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی ذاتی طمانیت کا اظہار کر کے مجھ کو ایک بدگمانی کے گناہ شدید سے نجات دی، میں آپ سے معذرت کرنے کو یہ خط لکھتا ہوں، مجھے لاہور کے متعدد حضرات نے تحریری و زبانی اطلاعیں دی تھیں کہ (اخبار) "ستارۂ صبح" کی آڑ میں آپ ہیں، مگر مجھے میر نیرنگ کا سب سے زیادہ یقین ہے، اس لئے میں اپنی بدگمانی کو واپس لے کر آپ سے عذر کرتا ہوں۔ اب مجھے اس تنگ و دو میں آپ سے کچھ سروکار نہ ہوگا"

مخلص دیرینہ
حسن نظامی

یہ تاریخی خط اس ناگوار علمی بحث کے خاتمے کا اصل محرک ہے جس کا جواب ڈاکٹر اقبال نے ۱۱ر جنوری ۱۹۱۸ء کو دیا تھا۔ اقبال کا یہ مطبوعہ خط جہاں تک میرے محدود مطالعے کا تعلق ہے غالباً "مکاتیب اقبال" میں شائع نہیں ہوا ہے۔ اس خط سے ثابت ہے کہ تصوف کے متعلق ڈاکٹر اقبال نے اپنی مثنویات میں جن تصورات کو پیش کیا ہے اُس وقت کے مباحثوں میں انھیں صحیح شکل نہیں دی گئی ہے اور مولانا ظفر علی خاں کے اخبار "ستارہ صبح" اور امرتسر کے اخبار "وکیل" میں جو گرما گرم مباحثے اس موضوع پر ہوئے تھے ان میں ڈاکٹر اقبال کا کوئی اشارہ یا ہاتھ نہیں تھا۔

ڈاکٹر اقبال کا یہ اہم خط من وعن ہفتہ وار "خطیب" دہلی مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۸ء سے نقل کیا جا رہا ہے جو "اقبالیات" سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔

لاہور ۱۱ جنوری ۱۶ء

مخدوم و مکرم جناب خواجہ صاحب!

السلام علیکم - آپ کا خط کئی دن سے آیا رکھا ہے مگر مجھے معروفیت رہی اس وجہ سے جواب نہ لکھ سکا معاف کیجئے گا۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میر نیرنگ صاحب نے آپ کو خط لکھا ہے جس نے آپ کو بدگمانی کے گناہ سے بچایا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

آپ کو معلوم ہے قریباً دو سال ہوئے میں نے ان اعتراضات کے جواب میں جو آپ نے "مثنوی اسرار خودی" پر کئے تھے چند مضامین مسائل تصوف پر لکھے تھے جس کا مقصود صرف یہ تھا کہ مسئلہ "وحدت الوجود" ان معنوں میں کہ ذات باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے، قرآن سے ثابت نہیں، اور رہبانیت میں اسلامی تربیت کا طریق صحیح ہے نہ سکر۔ آپ ہی کے "اخبار خطیب" میں حضرت صوفی قاری شاہ سلیمان نے ان دونوں مسائل کے متعلق میرے حق میں فیصلہ صادر فرمایا تھا۔ باوجود اس کے کہ مجھے ہمیشہ اس بات کا تعجب رہا کہ آپ اور آپ کے احباب اس اختلاف کی وجہ سے مجھے کیوں دشمن تصوف سمجھتے ہیں، یہ اختلاف کوئی نئی بات نہیں، بلکہ حضرات صوفیہ میں ایک عرصہ سے موجود ہے بہرحال جن خیالات کا اظہار میں نے "اخبار وکیل" میں کیا تھا ان کی صحت و صداقت کا مجھے اب تک یقین ہے گو ان پر مزید بحث کرنا کئی وجوہ سے غیر ضروری جانتا ہوں عوام بلکہ بعض خواص کو بھی ان اصولی امور میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس قسم کے مباحث اخباروں کے لئے موزوں ہیں، ان سب باتوں کے علاوہ "مولانا اکبر" نے (جن کا ادب احترام میں اسی طرح کرتا ہوں جس طرح کوئی مرید اپنے پیر کا احترام کرے) مجھے لکھا کہ یہ بحث غیر ضروری ہے۔ اس دن سے آج تک میں نے ایک سطر بھی ان مباحث پر نہیں لکھی گو ذاتی فائدے کے خیال سے مطالعہ جاری رکھتا ہوں۔ اب جو مولوی ظفر علی خاں صاحب نے "اخبار ستارۂ صبح" میں یہ بحث دوبارہ چھیڑی تو وجہ ان دیرینہ تعلقات کے جو میرے اور ان کے درمیان ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ اس بحث میں مجھے کمال دلچسپی ہے بعض لوگوں کو یہ بدگمانی ہوئی کہ "ستارۂ صبح" کے مضامین میں لکھتا ہوں یا لکھواتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم سے ایک سطر بھی اس بحث پر نہ نکلی اور نہ میں نے مولوی صاحب موصوف کو کوئی مضمون لکھنے کی تحریک کی ہے بلکہ پرائیوٹ گفتگو میں کئی امور میں میں نے ان سے اختلاف کیا ہے اس کے علاوہ میں تو اصولی بحث کو جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں اخباروں کے لئے موزوں نہیں سمجھتا چہ جائیکہ کسی اور کو اس کے جاری رکھنے کی تحریک کروں البتہ موجودہ نتائج کے حالات پر لکھنے اور ہمدردانہ لہجہ میں ان کے خیالات ۔۔۔ رسوم کی ۔۔۔ کرنے سے قوم کو ضرور فائدہ ہوگا، اگر مولوی ظفر علی خاں یا آپ اس طرف توجہ کریں تو "چشم ما روشن دل ما شاد" غرض کہ آپ کو میری نسبت بدگمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور اگر کسی وجہ سے بدگمانی ہو بھی گئی تھی تو آپ مجھ سے براہ راست دریافت کر سکتے تھے لوگ تو اس قسم کی باتیں اڑایا ہی کرتے ہیں۔ دو چار روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے بیان کیا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے مشہور کر رکھا ہے کہ اقبال نے اپنی ٹوپی ہمارے قدموں پر رکھ کر ہم سے معافی مانگی ہے اور آئندہ کیلئے توبہ کی ہے۔ میں نے انہیں یہ جواب دیا کہ جن لوگوں کے عقاید و عمل کا ماخذ کتاب و سنت ہے اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کی صحبت کے ایک لحظہ کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے، لیکن جو بات خواجہ حسن نظامی کی طرف سے منسوب کرتے ہو اس کے لغو ہونے میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ اگر آپ چاہیں تو یہ خط شایع کر سکتے ہیں۔

والسلام

محمد اقبال

از لاہور

بقیہ: عملی تنقید کے بارے میں

یعنی نفی کی نفی کر کے زندگی کی مثبت صورت پیش کرتا ہے۔ تبھی تو نقاد ادیب کی مستقبل خوبیوں، کوتاہیوں، خامیوں، دشواریوں اور چالاکیوں کو محسوس کر لیتا ہے۔ اگر ادیب بہت داخلی انداز میں بہادری کے قصے لکھتا ہے تو نقاد اس کے سماجی ماحول میں بے بسی کے احساس کو بھی پا لیتا ہے۔ اسی طرح کسی کے انقلاب کیلئے غیر متوازن اور جلد بازی کے تذکروں میں وہ ایسی سماجی حقیقت بھی پا لیتا ہے کہ لکھنے والا انقلاب کے حصول کے لئے مصائب سے گھبراتا ہے اور بنیادی طور پر انقلاب کا نادان یا کمزور دوست ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تنقید ادبی تخلیق کے لئے ویسی ہی ضروری چیز ہے جیسے انسانی زندگی کے لئے پانی اور روشنی کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں تنقید پر نئی نسل کے رہنماؤں نے خاصا قیمتی اور بیش بہا کام کیا ہے مگر عملی تنقید پر کافی کام کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اردو تعلیم یافتہ لوگوں میں ادبی ذوق اور ان میں سے اچھے فنکار پیدا کرنے کے لئے نہ صرف حال کو سنوارنا کافی ہوگا بلکہ ماضی کی چند بیماریوں سے بھی چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ اردو زبان کا تعلق چونکہ اردو بولے جانے والے علاقوں کے مسلمانوں کی اکثریت سے بھی ہے اس لئے ان کے تاریخی سماجی رول کا بھی اثر ہماری روایات پر پڑتا ہے۔ اردو بولنے والوں کی صدیوں کی علیحدگی پسندی اور سماج سے دوری کی وجہ سے فنکاروں کو ابھرنے سے روکنے کی روایات کی کہانی آزاد کی کتاب "آب حیات" سے بھی واضح ہوتی ہے۔ اردو کے "چاسروں" میں نئے فنکاروں کو پست ہمت کرنے کی روایت والوں میں بدنصیبی سے ع

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

بہرحال اپنے ماضی کو تو ہم بدل نہیں سکتے البتہ حال اور مستقبل کو سنوارا جا سکتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تنقید دبے کی، فری لانسر تنقید رائج کی جائے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہمارے مشاعروں اور ادبی جلسوں کی تہ میں کچھ روگی جراثیم بھی آسانی سے نظر آ سکتے ہیں۔ یہ جراثیم اکھاڑے بنانے کی خواہش کے جراثیم ہیں۔ ظاہر ہے ان جراثیم کی خاطر ہم مشاعروں اور ادبی محفلوں کی افادیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ مگر ہم ان میں تو ترمیم کر سکتے ہیں۔

اردو تعلیم یافتہ لوگوں میں ادبی محفلوں کے چلانے کا شعور کافی ہے۔ اس شعور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم اپنی ادبی محفلوں کو ایسے منظم طریقے سے چلا سکتے ہیں کہ ادبی انجمنیں اپنی محفلوں کے لئے باضابطہ نقادوں کی ذیلی کمیٹیاں بنائیں۔ ان نقادوں کا کام یہ ہو کہ محفل میں تماشائیوں کی طرح بیٹھے جو دعوائے تنقید میں ہوتی ہیں ان کے مضمون یا شعر کو منتخب کیا جائے۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ نیا نیا لکھنے والا ادبی محفل میں یہ سوچ کر آتا ہے اس کی بہت قدر افزائی ہوگی مگر اسٹار قائدین ہیں سے ہر ایک جب اپنی اہمیت جتانے کیلئے اپنے اپنے حصے کا تنقیدی پتھر اس پر پھینکتا ہے تو وہ بیچارہ ہمیشہ کیلئے شہید ہو جاتا ہے۔

ذیلی کمیٹیوں کے ان نقادوں کے ذمہ یہ فرض عاید ہو گا کہ وہ مضمون نگار یا شاعر کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے تنقید کو بھی مؤثر کریں۔ اس طرح دو تنقیدوں میں تنقید کے وہ متوازی خطوط کھینچے جائیں گے جن کے اندر تنقید کرنے کم داخل ہوں گی۔ پہلے انتہائی خلاء سے وہ یہ جائزہ لیں گے کہ مصنف یا شاعر نے سب سے اچھی بات کیا کہی ہے جو ہمیں پسند آئی ہو، متاثر کیا ہو اور جس سے ہمیں تسکین اور خوشی حاصل ہوئی ہو۔ Sainte Beuve جو جمالیاتی ادبی تحریک کے موجد تھے کہتے ہیں کہ

محض کسی ادب پارہ کا لوگوں کو متاثر کرنا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ آیا ایسی تسکین، مسرت اور ایسا تاثر جائز بھی ہے۔ دوسرے انتہائی خلاء سے ایسی بات ٹٹولی جائے گی کہ مصنف کی تخلیق میں سب سے خراب یا سقمی کوتاہی کا کیا پہلو ہے جس کی طرف واجبی الفاظ میں اشارہ کرنا نہایت ضروری ہو۔ یہ دو انتہائی محدود سوال اٹھانے میں نقاد اس بات کو فراموش نہ کرے کہ بنیادی طور پر تنقید ایک موضوعی عمل ہے جس میں نقاد کی انفرادیت بھی کام کرتی ہے۔ دوسری طرف جس شخص پر تنقید کی جاتی ہے اسکی نفسیات بھی بہت داخل ہوتی ہیں۔ عام حالت میں کوئی شخص خوشی سے تنقید پسند نہیں کرتا کیونکہ تنقید فرد کی انا پر براہ راست حملہ کرتی ہے۔ شخصیت کے سارے عناصر میں سب سے زیادہ حساس اور ناقابل تسخیر شے اس کی انا ہے اس لئے مصنف کی انا پر ایسا بھرپور حملہ صرف اسی وقت ہونا چاہیئے جب آپ تصنیف میں تمدنی ترقی اور انسانیت کی دشمنی کو پائیں۔ ورنہ تنقید کا نشتر زیادہ سے زیادہ میٹھا، سنجیدہ، مفید اور تکلیف نہ پہنچانے والا ہونا چاہیئے۔

عملی تنقید میں ایک اور خرابی جو اکثر دیکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم مصنف یا شاعر کے مادی پس منظر سے بالکل بے بہرہ ہو کر بلند آسمانی معیار سامنے رکھ کر ہر ایک کو ایک ہی چھڑی سے ناپتے ہیں۔ یہ طریقہ غیر سائنٹفک ہے۔ انیسویں صدی کا مشہور فرانسیسی نقاد Taine کہتا ہے کہ جمالیاتی ذوق کے لئے مطلق معیار کبھی ممکن نہیں ہیں اور یہ کہ وہ تاریخ اور زمانے کے تقاضوں سے متعین ہوتے ہیں۔ Sainte Beuve تو یہاں تک کہتا ہے کہ کسی کے ادبی کارنامے کو پرکھنے کے لئے مصنف کی زندگی اور پس منظر سے واقفیت بہت ضروری ہے اس لئے ادبی نقادوں کو تنقید شروع کرنے سے پہلے مصنف کی زندگی کے پس منظر اور سوانحی پہلو کو سامنے رکھنا چاہیئے۔

اچھے ادب کی تخلیق کے لئے ادبی خدمات انجام دینے والوں میں ایسی روایات لانے کی بھی ضرورت ہے کہ ہم جن کے بارے میں لکھتے ہیں ان کے حالات زندگی کا ہم راست مطالعہ کریں۔ امیل زولا کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ناول "جرمنال" لکھنے کے لئے فرانس کے کان کنوں کی زندگی کا مطالعہ مزدوروں میں رہ کر کیا تھا۔ تب ہی کہیں وہ کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والوں کی ایسی سچی تصویریں کھینچ سکا ہے۔ اسی طرح جب ہم کسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں تو کسانوں کی زندگی کا قریبی مطالعہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہماری حالت یہ ہے کہ ہم شہروں میں بیٹھ کر دیہاتوں کے اردو بولنے والے عوام کے تعلیمی مسائل پر لکھتے تو ہیں لیکن ہم دیہاتوں میں جانے اور عوام کے مسائل سے واقفیت حاصل نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے ہم لکھتے کچھ اور ہیں، لیکن بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

تنقید پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر جب تک کہ مخصوص حالات میں صحت مند، اضافی ٹھوس تنقید کے اصول پر چلنے کا فن اور اس کی رہنمائی نہ ہو عملی تنقید سے زاجیت دور نہیں ہو سکے گی۔ مجھے امید ہے کہ ادبی تنقید کے رہنماؤں کی اس طرف ذرا سی توجہ اردو ادب کی اس کمی کو بھی پورا کر دے گی۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا